اخلاقُ وفلسفۂ اخلاق

از مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوارروی

ذیل کا مضمون مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی کتاب ،، اخلاق وفلسفۂ اخلاق ،، سے ماخوذ ہے جو بڑے سائز کے تقریباً ۵۸۰ صفحات پر ندوۃ المصنفین کی طرف سے عنقریب شائع ہونے والی ہے، یہ کتاب ،، اخلاق وفلسفۂ اخلاق ،، اور اسلامی اخلاق کی برتری وفضیلت پر ہماری زبان میں پہلی کتاب ہے، ذیل کے مختصر مضمون سے اصل کتاب کی قدر وقیمت کا پورا اندازہ تو نہیں ہوسکتا تاہم اس سے ایک حد تک مباحث کتاب پر روشنی پڑتی ہے

معہ برہان،،

اسلامی نظریہ

گذشتہ ابواب میں اخلاق، نظریۂ اخلاق اور فلسفۂ اخلاق پر تفصیلی بحث ہوچکی ہے۔ مگر اس چوتھے باب کے اضافہ کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ،، علم الاخلاق ،، کے طالب کے سامنے دو حقیقتوں کا اظہار صراحت کے ساتھ ہوجائے، اور اخلاقی مباحث میں بعض حقائق پر جو پردے پڑے ہوئے ہیں وہ روشنی میں آجائیں۔

(۱) موجودہ علمی ترقی کے دور میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ ،، علم الاخلاق ،، نے اجتماعی اخلاق کے سلسلہ میں جو ترقی کی ہے وہ جدید نظریوں کی مرہون منت ہے اور ،، علم الاجتماع ،، کی

تدوین و ترتیب کی بدولت عالم وجود میں آئی ہے، اور اس سے قبل ان مسائل کا وجود مذہبی علم الاخلاق میں نہیں پایا جاتا۔

اس کتاب کے بعض نقل کردہ اقوال سے بھی مترشح ہوتا ہے لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جدید علم الاخلاق سے ..... کہ جس کی عمر زیادہ سے زیادہ دو صدی کے اندر محدود ہے ..... صدیوں پہلے علمار اسلام نے تصوف و اخلاق کے نام سے جو تصانیف کی ہیں اُس کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اصول و مبادی اخلاق کا کوئی جدید شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس قدیم لٹریچر میں تفصیلی حقائق کے ساتھ موجود نہ ہو، البتہ طرزِ ادا، طریق استدلال، وضع اصطلاحات، تعبیر نظریات میں کچھ ایسا فرق ہو گیا ہے کہ ایک ہی حقیقت کا انمار جب ،، اسلامی لٹریچر میں کیا جاتا ہے تو وہ ایسی خاص شکل و صورت میں ہوتا ہے کہ وہی حقیقت جب ،، جدید علم الاخلاق ،، میں نظر آتی ہے تو نئے قالب اور نئی صورت کے ساتھ اس طرح آشکارا ہوتی ہے کہ گویا یہ ایک نئی اور انوکھی چیز ہے اور اس کا آب و رنگ ہی جُدا ہے۔

یہ غلط فہمی اُس وقت اور بھی زیادہ قوی ہو جاتی ہے جب خود اس علم کے اہلِ ثروت (مسلمان) اپنی پونجی سے ناآشنا محض ہوتے، اور اپنی ہی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے دوسروں کے سکّوں کو دیکھ کر حسرت و افسوس کے ساتھ اپنی تہی دامنی کا اعتراف کر لیتے ہیں، اور جوش و یقین اور مرعوبیت کے ساتھ ایمان لے آتے ہیں کہ ،، علم الاخلاق ،، کے یہ جواہر ریزے یورپ کے جدید علمی اکتشافات ہی کا نتیجہ ہیں۔

اس کا قدرتی اثر طبائع پر یہ پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر ،، اسلامی علوم اخلاق ،، سے سرد مہری برتتا ہے، بلکہ عربی و فارسی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے ،، جن میں یہ جواہر پارے محفوظ ہیں ،، نظر حقارت سے پیش آتا ہے اور اپنی مذہبی علوم سے نادانی کو جدید علوم کی معلومات عامہ کے

پردہ میں چھپالے کی سعی کرتا ہے۔

دوسری جانب ایک ایسا طبقہ ہے جو اگرچہ جدید علوم سے مرعوب ہو کر اپنے ذخیرۂ علم کو نظر حقارت سے تو نہیں دیکھتا مگر جہل و نادانی میں پہلے طبقہ سے بھی آگے رہتا ہے، اُس کو مذہب سے شیفتگی ضرور ہوتی ہے لیکن وہ مذہبی علوم خصوصاً علوم اخلاق سے یکسر بیگانہ اور ناواقف ہوتا ہے، اور ساتھ ہی جدید علوم سے بے بہرہ۔ وہ ان حقائق کو نہ خود سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو سمجھانے کے قابل بنتا ہے بلکہ ایک ایسی تقلید جامد پر قناعت کر لیتا ہے جہاں حسنِ اعتقاد کے علاوہ علم و عمل کی روشنی سے محرومی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

تو ان امورِ ثابتہ کے پیش نظر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جن حقائقِ علمیہ کو گذشتہ ابواب میں علمی نظریوں، اور عملی نظام کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، ایک مستقل باب میں اُن سے متعلق علماءِ اسلام کے مباحث کو بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ تاکہ علم کی حقیقی روشنی جو قدیم و جدید کے فرق سے اپنی حقیقت کبھی تبدیل نہیں کرتی "اسلامی رنگ" میں بھی واضح ہو جائے اور اگرچہ جستہ جستہ یہ خدمت گذشتہ ابواب میں بھی انجام پاتی رہی ہو تاہم مستقل عنوان بن کر دونوں قسم کے طالبانِ علوم اخلاقی کے سامنے یہ مستور حقیقت بھی روشنی میں آجائے کہ اس راہ میں بھی اسلام کا دامن کس قدر وسیع اور اُس کی تعلیم کا پایہ کس درجہ بلند ہے اور یہ کہ علماءِ اسلام نے "علم الاخلاق" کے انفرادی و اجتماعی دونوں گوشوں کی خدمت کس وسعت نظر، بلندی فکر، اور عملی تجربات و مشاہدات کے ساتھ انجام دی ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ ایک جانب ظن و عقل کو دلائل اور اوہام کی آمیزش سے متاثر نتائج ہیں اور دوسری جانب حقائق و یقینیات کی قوت اور وحی الٰہی کے زیرِ اثر محکم اور روشن احکامات ہیں۔

(۲) **اسلام**، بدراصل صحیح عقائد و افکار، کریمانہ اخلاق، اور اعمالِ حسنہ کے مجموعۂ کمال کا نام ہے۔ یعنی ایک انسان اگر خدا کی وحدانیت کا یقین رکھتا، اور شرک سے بیزاری ظاہر کرتا ہے

توجس طرح یہ ایک مذہبی عقیدہ ہے اسلام کی نگاہ میں اُسی طرح یہ ایک کریمانہ خُلق ہے جو بندہ کو اپنے خدا کے ادا، فرض میں اختیار کرنا ضروری ہے۔ اور اگر وہ توحید کا منکر ہے تو وہ خدائے تعالیٰ کے اُن حقوق و فرائض کے اعتبار سے جو بندہ ہونے کی حیثیت سے اُس پر عائد ہیں، بداخلاق بھی ہے اسی طرح دوسرے عقائد کا حال ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اگر اسلامی واجبات و فرائض ہیں تو بلاشبہ اُن کا تارک مذہبی نقطۂ نگاہ سے "بداخلاق" بھی ہے اگرچہ علم الاخلاق کی عام بول چال میں وہ کریم الاخلاق ہی کیوں نہ شمار ہوتا ہو۔ نیز بہت سے ایسے مذہبی احکام ہیں جو اگرچہ اخلاق کی عام صف میں بھی جگہ پاتے ہیں مگر مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس لئے واجب العمل ہیں کہ وہ احکام الٰہی ہیں اور فرائضِ مذہبی۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ "علم الاخلاق" کا اسلامی نقطۂ نظر عام علمی نقطۂ نظر سے زیادہ وسیع، زیادہ بلند، اور مآل و انجام کے اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط و مستحکم ہے اس لئے کہ علم الاخلاق کا علمی نظریہ ایک صاحبِ اخلاق کو لذت، سعادت، منفعت، یا خیر کی اُس مثل اعلیٰ تک ہی پہنچا دینے کا کفیل ہے جو فانی دنیا کے دائرہ میں محدود ہے۔ لیکن اسلامی "علم الاخلاق" کی کفالت و ضمانت کا رشتہ ہر قسم کی دنیوی سعادتوں کی کفالت کے ساتھ ساتھ ابدی و سرمدی سعادت و خیر کی مثل اعلیٰ تک رسائی سے بھی وابستہ ہے جو مذہبی زبان میں "عالمِ آخرت" "عالم روحانیت اور وصول الی اللہ" کے عنوانات سے معنون ہے۔ تو ایسی صورت میں ہم کو یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اخلاق کا علمی و عملی پہلو "جدید علم الاخلاق" کے نظریات و عملیات کی حدود سے بہت آگے اور خصوصی اساس و بنیاد کے اعتبار سے بلند تر ہے۔ اس لئے یہ سعی تو بیکار ہوگی کہ ہم کورانہ تقلید کے ساتھ اس سلسلہ کے ہر شعبہ میں خواہ مخواہ دونوں کے ہم آہنگ ہونے کا ثبوت دیں، کیونکہ اخلاقِ اسلامی کو عقائدِ اسلامی سے بالکل جدا کر لینا اُس کی اصل حقیقت کو فنا کر دینے کے مرادف ہے۔ البتہ یہ اقدام مستحسن اور صحیح ہوگا کہ اس موقعہ پر ہم اخلاقِ اسلامی کے صرف ان ہی شعبوں کو بیان کریں جو مذہب کے ساتھ ساتھ

عام علم وعقل کی نگاہ میں بھی "علم الاخلاق" کے شعبے شمار ہوتے ہیں۔ اور جبکہ اسلام اس کا مدعی ہے اور بجا طور پر مدعی ہے کہ وہ دینِ فطرت ہے اور صحیح عقل اور آزادیِ افکار کا مذہب ہے تو بلاشبہ اُس کے علم الاخلاق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہونا چاہئے جو عقلِ سلیم اور افکارِ صحیح سے متصادم اور اُسکے مخالف ہو اگرچہ اُس کے بعض شعبے اُن کی دسترس سے آگے اور مادی حیات سے ماورا بھی ہوں۔ اور عقائد و احکام کا وہ مخصوص باب جو اسلامی علم الاخلاق کی خصوصیات میں سے ہے علم کلام و عقائد کیلئے چھوڑ دینا مناسب ہی ہے پس جس منزل سے ہم گذرنا چاہتے ہیں اگر ان دو حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر گذرنے کی کوشش کریں گے تو انشاء اللہ حصولِ مقصد میں ناکام نہ رہیں گے۔

بہرحال زیر بحث باب میں صرف یہی امور قابل تذکرہ ہیں جن میں سے ایک "علم الاخلاق اور علماء اسلام" کے عنوان سے معنون ہوگا، اور دوسرا "اسلامی عملی اخلاق" کے عنوان سے۔ اور ان ہی کے ذریعہ سے "علم الاخلاق" کے تمام مباحثِ علمی و عملی کی ماہیت اور حقیقت آشکارا ہوجائیگی

علمِ اخلاق اور علماءِ اسلام

"علم الاخلاق" تعلیمات اسلامی کا ایک اہم جز ہے اور جس طرح اُس کے قوانین دینی و دنیوی ہر گوشہ میں کامل و مکمل ہیں اُسی طرح اس گوشہ میں بھی وہ ایک بے نظیر اور بلند مرتبہ "قانون" کا پیغامبر ہے۔

اسلام کے داعی اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا سب سے بڑا مقصد اسی "اخلاق" کے "عروج کامل" کو بتایا ہے۔

انی بعثت لاتمم مکارم الاخلاق[1] میں اسلئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کریمانہ کو اُن کی

[1] ترمذی ابواب البر

اور قرآن عزیز نے آپ کے لئے سب سے بڑا شرف اسی کو قرار دیا ہے

انك لعلیٰ خلق عظیم — بلاشبہ آپ عظیم الشان اخلاق کریمانہ کے حامل ہیں

"اخلاق" کے بارہ میں دورِ قدیم کے فلاسفۂ یونان، اور دورِ جدید کے فلاسفۂ یورپ کے جن نظریوں اور عملیوں کا صفحات گذشتہ میں ذکر ہوا ہے، وہاں اگرچہ ضمناً یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ اسلام کا نظریۂ اخلاق ازمنۂ قدیم و جدید کے نظریوں سے زیادہ بلند اور زیادہ مکمل ہے۔ اور اگرچہ موجودہ دورِ علمی میں "علم الاخلاق" کے مباحث "علم الاجتماع" کے نقطۂ نظر سے بہت پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں تاہم اصل اور بنیاد کے حقیقی افادہ کے پیشِ نظر علمی و عملی دونوں گوشوں میں علماء اسلام کے "مباحث اخلاق" سے آج بھی آگے نہیں ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "علم الاخلاق" کے بارہ میں علماء اسلام کے نظریوں کو قدرے تفصیل سے بیان کر دیا جائے

تعریف

امام غزالی کا نظریہ امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے "خلق" کی حسب ذیل تعریف کی ہے:-

"خلق" نفس کی ایک ایسی کیفیت اور ہیئت راسخ کا نام ہے کہ اُس کی وجہ سے بہ سہولت اور کسی فکر اور توجہ کے بغیر سے اعمال کا صدور ہو سکے۔ پس اگر یہ ہیئت اس طرح قائم ہے کہ اُس سے عقل و شرع کی نظر میں اعمال حسنہ صادر ہوتے ہیں تو اُس کا نام "خلق حسن" ہے اور اگر اُس سے غیر محمود افعال کا صدور ہوتا ہے تو اُس کو "خلق سیئ" اور "بد اخلاقی" کہتے ہیں[1]"

اور آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"خلق" نیک و بد عمل، اُس پر قدرت، اور نیک و بد عمل کی تجویز کا نام نہیں ہے بلکہ اُس ہیئت و صورت کا نام ہے جس سے نفس میں ضبط و اقدام کی استعداد پیدا ہو جائے۔

[1] احیاء العلوم جلد ۳ صفحہ ۵۶

اس لئے خلق نفس کی ایک باطنی صورت وہیئت کا نام ہے[1]۔

شاہ ولی اللہ کا نظریہ | اور حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ شارع نے انسان کو ایجاب وتحریم کا جس بنا پر مکلف بنایا ہے وہ اعمال ہیں جن کی تحریک، نفس کی اُن "کیفیات" کے ذریعہ ہوتی ہے جو عالمِ آخرت میں نفس کے لئے مفید یا مضر ثابت ہونگی۔

اس قسم کے اعمال سے دو طرح بحث کی جاتی ہے ایک یہ کہ اُن اعمال سے اس حیثیت میں بحث کی جائے کہ وہ انسانی نفوس کو مہذب بنانے کا ذریعہ ہیں اور ان اعمال سی جو ملکاتِ فاضلہ مقصود ہیں اُن تک نفس کو پہنچانے کا آلہ ہیں اسی کو علم الاحسان (علم الاخلاق) کہتے ہیں[2]

اور صاحبِ "منازل" کا قول ہے کہ :-

"خلق" انسان کی اُس کیفیت کا نام ہے جو اُس کی طبیعت کے مختلف اوصاف وحالات کو جد وجہد کرکے اپنی جانب راجح کرلے۔

ایک شاعر کہتا ہے ؎

ان التخلق یاتی دونہ خلق (یعنی) اوّل ایک چیز کی عادت ڈالی جاتی ہے اور بعد میں وہ ہی "خلق" بن جاتی ہے۔

غرض وغایت

اخلاق کی غرض وغایت حصولِ سعادت ہے | شاہ ولی اللہ دہلوی "اخلاق" کی غرض وغایت، سعادتِ حقیقی کا حصول اور مثل اعلیٰ تک رسائی سمجھتے ہیں اور "سعادت" پر ایک مستقل بحث فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

---

[1] احیاء العلوم صفحہ ۵۶ جلد ۳ [2] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱

یہ واضح رہے کہ انسان میں ایک بہت بڑا کمال ودیعت ہے جس کا تقاضہ اُس کی صورت نوعیہ کرتی ہے یعنی انسان جس ہیئت وصورت کی وجہ سے انسان کہلاتا ہے اُس کا تقاضہ ہے کہ اُس میں یہ عظیم الشان کمال موجود ہو جس سے تمام مخلوق محروم ہے۔ اور اسی کا نام سعادتِ حقیقی ہے۔

سعادت

دراصل انسان کی قوتِ بہیمیہ کا نفسِ ناطقہ کے، اور خواہشات نفس کا عقلِ کامل کے زیر اثر ہو جانا "سعادت" کہلاتا ہے۔

اور مقامِ تحقیق یہ ہے کہ سعادت حقیقی "عبادت الہیہ" کے بغیر حاصل نہیں ہوتی اسی لئے مصالح کلیہ کا یہ تقاضہ ہے اور وہ افرادِ انسانی کو "نوعِ انسانی کے فرد" ہونیکی حیثیت سے اس کی دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنی صفات کی اصلاح کرے کیونکہ یہ دوسرے درجہ کا کمال ہے اور اوّل درجہ کا کمال اسی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ کہ انسان کو اپنی ہمت کی "نہایت قصویٰ" اور اپنی نظرِ بصیرت کی "نہایت عظمیٰ" صرف تہذیب نفس کو بنانا چاہیے اور نفس کو اُن ہیئتوں اور کیفیتوں سے مزین کرنا چاہیے جو ملاء اعلیٰ سے ملتی جلتی ہوں اور جن کی وجہ سے اُس پر عالم ملکوت کے فیضان کی بارش ہونے لگے۔[1] الخ

سعادت کے درجات شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ بھی ہے کہ انسان، درجات سعادتِ میں اپنی اپنی استعداد کے مطابق مختلف ہیں۔ فرماتے ہیں۔

انسان، عام اخلاق مثلاً شجاعت وغیرہ میں مختلف ہیں، بعض وہ ہیں جو اخلاق کے خلاف خراب عادت وجبلت رکھنے کی وجہ سے اُس سے قطعاً محروم رہتے ہیں، اور اُن میں

[1] مختصر از حجۃ اللہ جلد اوّل باب حقیقۃ السعادۃ صفحہ ۵۰، ۵۱

حصولِ سعادت کی اُمید ناممکن ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی خلقی ضعیف القلب کا صفتِ شجاعت سے محروم ہو جانا۔

اور بعض میں اگرچہ اُس کا بالفعل وجود نہ ہو مگر افعال و اقوال کی مسلسل رفتار، ہیئات اور ماحول کے اثرات کا تاثر، اور مناسب حالات کے وجود کی وجہ سے اس کا حصول متوقع ہوتا ہے اور ارباب مثل اعلیٰ، اور مصلحینِ قوم کے حالات اور تذکروں اور حوادث و آلام کی مسلسل حکایتوں اور اسی طرح کے دیگر امور سے اس کے پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔

اور بعض میں اُس کا وجود بالفعل ہوتا ہے مگر چونکہ وہ چھوٹے چھوٹے تکدرات و تلوثات سے بھی دوچار ہوتا رہتا ہے اس لئے درجۂ کمال کو نہیں پہنچتا اور جیسا کہ گندک کی آگ سے قریب ہونے میں ہر وقت آگ لگ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اسی طرح اُس کے حصولِ سعادت سے محروم رہنے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔

اور بعض میں اُس کا وجود درجۂ کامل اور حظِ وافر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ موانع اور رکاوٹیں اگر آئے بھی آئیں تو وہ اُن سب کو عبور کر کے کمال کے انتہائی درجہ کو حاصل کر لیتا ہے اور بغیر کسی تحریک اور دعوت و رسم کے اُس کے لئے وہ طبعی چیز بن جاتی ہے۔

یہ علم الاخلاق میں "امامت" کا وہ درجہ ہی جس سے اوپر کوئی اور امامت نہیں ہے، اس لئے ضروری ہے کہ جو اس سے نیچے کے درجات ہیں اُن کے اصحابِ درجات اُسکی پیروی کریں اور اُس کے اقتدار کو فرض جانیں۔ بہرحال جس طرح انسان، ان علم اخلاق میں مختلف درجات رکھتا ہے جو اس کی "سعادت" اور مثل اعلیٰ کا "مدار" ہیں۔

چنانچہ بعض انسان اپنی خلقت و جبلت کی افتاد ہی میں اُس سے محروم ہیں، اسی

گروہ کے لئے ارشاد ہے

صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ — بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں بس یہ حق کی جانب ہرگز نہ لوٹیں گے۔

اور بعض میں اگرچہ بالفعل ان اخلاق کا وجود نظر نہیں آتا لیکن سخت محنت اور شدید ریاضات سے اُن کا حصول متوقع ہے ان ہی کو دعوت، و محرکات کی ضرورت ہی اور انسانوں کے عام افراد اسی درجہ پر قائم ہیں اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت و تبلیغ کا یہی محور و مرکز ہیں، اور ان کی بعثت کا مقصدِ اولین انہی کی اصلاح و تربیت ہے۔

اور بعض میں اُن کا وجود اجمالی صورت میں ہوتا ہے اور اندر ہی اندر اُس میں شاخیں پھوٹتی رہتی ہیں مگر وہ اُن کی تفصیلات اور اجمال کے بسط و کشاد میں کسی امام کے محتاج رہتے، اور اس کی راہنمائی کی پناہ چاہتے ہیں۔

ان کا حال بالکل ایسا ہے۔

یکاد زیتھا یضیٔ ولو لم تمسسہ نار — قریب ہے کہ اُس کا تیل بغیر آگ کے چھوئے ہی روشن ہو جائے۔

یہ افراد اس راہ سعادت کے جوان ہمت و پیشرو ہیں اور ان کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لئے انبیاء علیہم السلام حقِ امامت ادا کرتے ہیں اور اُنکی رہنمائی کرکے اُن کو حقیقی مثلِ اعلیٰ اور سعادتِ کبریٰ تک پہنچاتے ہیں۔

سعادت کے اسباب میں، یعنی اخلاق کاملہ تک پہنچنے اور اُن میں کمال حاصل کرنے میں دوسرے اور تیسرے درجات کے حاملین جس طرح ائمہ اخلاق اور مصلحین کاملین کے محتاج نظر آتے ہیں اور انسانی دنیا کی تمام آبادی نبی و رسول کی بعثت، انبیاء و رسل کی اہمیت اور

اشد ضرورت پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہی تفسیر ہے اس حدیث کی "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"[1]

حصولِ سعادت کے طریقے جبکہ "اخلاق" کا منشا حصولِ سعادت اور حقیقی مثلِ اعلیٰ تک رسائی ہے اور اُس کے حصول کے لئے مختلف طریقوں میں سے حضرت شاہ صاحب کے نزدیک دو ہی بہتر طریقے ہیں، فرماتے ہیں۔

معلوم رہے کہ یہ "سعادت" دو طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ خود کو طبیعت بہیمیہ سے بالکل جدا کرلے یعنی طبیعت اور اُس کے جوش کو روکنے کے تمام وسائل اختیار کرے اور اُس کے علوم وحالات کو سرد کردے اور اپنی تمام توجہ عالمِ جہات سے پرے عالمِ ملکوت کی جانب متوجہ کردے اور نفس کو ایسے علوم (علوم الٰہی) کے قبول کرنے کی طرف مائل کرے جو کلیۃً زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوں، اور مجلسی اُنس ورغبت، اور حسّی لذات کے متضاد لذتوں کا خوگر بنے تا آنکہ عوام اور پست خیال انسانوں کی ہمنشینی واختلاط سے پرہیز کرنے لگے اور اُس کی رغبتیں اُن کی رغبتوں سے جدا اور اُس کا خوف اُن کے خوف سے الگ شاہراہ پر قائم ہوجائے۔

یہ طریقہ اُن ربانی انسانوں کا ہے جو صوفیہ کے گروہ میں سے حکمار اور مجاذیب کہلاتے ہیں

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قوت بہیمیہ کی اصلاح کی جائے اور اصل قوت کی بقار کے ساتھ ساتھ اُس کی کجی کو درست کیا جائے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ افعال، کیفیات اور اذکار کے ذریعہ قوت بہیمیہ سے وہ سب کچھ ادا کرایا جائے جس کا نفس ناطقہ خواہشمند ہو "جس طرح کوئی گونگا دوسرے انسانوں کے اقوال کو اشارات کے ذریعہ ادا کرتا ہے" یعنی عقل، قوت بہیمیہ پر حاکم اور غالب ہوجائے، الخ

[1] خلاصہ بحث سعادت از حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل

اور حصول سعادت کے اس طریقے سے لوگ عام طور پر واقف و متعارف ہیں اللہ تعالیٰ کی فضل سے جو فہم و فراست مجھے عطا ہوئی ہے، وہ اسی طرف راہنمائی کرتی ہے کہ اس کا مرجع اور منبع چار خصائل" ہیں اور جب یہ نفسِ ناطقہ اور عقل کے غلبہ سے قوت بہیمیہ پر حاوی اور طاری ہو جاتی ہیں تو مقصد "حصول سعادت" حاصل ہو جاتا ہے۔

اور اس حالت میں انسانی کیفیات ملاء اعلیٰ کی صفات (ربانی صفات) سے قریب تر اور زیادہ مشابہ ہو جاتی ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد اسی کی دعوت و تربیت پر مبنی ہے اور درحقیقت "شرائع" اور "مذاہب" اسی کی تفصیل و تفسیر ہیں اور یہی اُن کے وجود کا حقیقی محور و مرکز ہے۔

وہ چار بنیادی خصائل حسب ذیل ہیں۔

(۱) طہارت (۲) اِنابت (۳) سماحت (۴) عدالت

فطرت سلیم کے مالک، صحت مزاج کا حامل اور کیفیات سفلیہ دنیہ سے پاک انسان اگر دنیوی خواہشات کی تلویث سے ملوث ہوتا ہے تو فطرت اُس پر تکدر، ملال، اور تنگ دلی کا غلاف چڑھا دیتی ہے۔ اُس کی زندگی ان آلودگیوں سے ڈوبتی ہوئی سی نظر آنے لگتی ہے اور اس حالت میں وہ قوائے بہیمیہ کے امثال کے قریب ہو جاتا ہے اور وساوسِ شیاطین اُس پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔

پس اگر وہ جلد متنبہ ہو کر ان جسمانی اور روحانی کدورتوں سے جدا ہو جاتا ہے اور اُن سے صاف ہو کر بے لوث بن جاتا ہے تو غبار آلود زندگی اور کثافتوں سے برتر ہو جانے سے اُس کی نفسیاتی کیفیات اُن روحانی صفات کے مشابہ ہو جاتی ہیں، جو "ملاء اعلیٰ" سے قریب ہیں، اور اُس کے ملکاتِ نورانی میں ضیاء اور روشنی چمک اُٹھتی ہے اور اس قابل

ہو جاتا ہے کہ قوتِ عملیہ کی استعداد کے مطابق اپنے نفس کو صاحبِ کمال بناسکے اور اُسمیں فرشتوں کے الہامات کے قبول، انوار الہٰی کے ظہور، ۔ پاک، طیب، اور مبارک اشیار کے ساتھ مشابہ ہونے اور دنیا و دین کا بہترین انسان بننے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے انسان کی اسی استعداد و قوت کا نام ،، طہارت ،، ہے

اور اگر انسان اپنی فطرت سلیمہ اور صفا قلب کے ساتھ خدا تعالیٰ کی نشانیوں کے ذکر، اُس کی صفات کی فکر، اور اُن سے نصیحت و تذکیر کی جانب متوجہ ہوتا ہے تو اُس کے نفس ناطقہ کو تنبہ پیدا ہوتا، اور اُس کے حواس اور اُس کا تمام جسم اُس کا مطیع ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اس کیفیت کے وقت تک حیران و درماندہ ہستی نظر آنے لگتا ہے ۔ خود بخود اُس کی توجہ عالم قدس کی جانب ہو جاتی ہے ، اس حالت پر پہنچکر وہ خود کو اس طرح بیچارہ اور عاجز دیکھتا ہے جس طرح با اختیار بادشاہ کی درگاہ میں ایک عام اور بے حیثیت انسان ۔

اور روحانی حالات میں سے یہ ،، حالت ،، ملاء اعلیٰ کے احوال کے مشابہ، اور روحی درجات میں سے اُس درجہ سے قریب تر ہے جس میں ،، روح ،، اپنے خالق کے جلال و جبروت کی جانب متوجہ ، اور اُس کی تقدیس میں مستغرق رہتی ہے ۔ اور اس حالت میں نفسِ انسانی اپنے علمی کمالات کی طرف بلند پروازی کے لئے اس طرح مستعد ہو جاتا ہے ۔ گویا اُس کے لوحِ ذہن پر معرفتِ کردگار کے نقوش نقش ہوتے جارہے ہیں ۔

یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو ذوق اور وجدان سے تعلق رکھتی ہے اور جس کا معرض تحریر میں آنا دشوار ہے ۔ اسی کیفیت کا نام تصوف و اخلاق کی اصطلاح میں ،، اخبات (بیخودی) ہے ۔ اور اگر نفس قوت بہیمیہ کے اسباب و دواعی سے باغی ہو جائے ۔ اور اُس پر نہ

بہیمیت کے نقوش منقش ہوسکیں اور نہ اُس کے اثرات کا لوث اُس تک پہنچ سکے تو اس کا نام "سماحت" ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نفس، جب اپنے دنیوی کاروبار میں مصروف ہوتا اور ازدواجی زندگی، اور معاشی زندگی سے دوچار ہوتا ہے تو اُس کی دو حالتیں ہوتی ہیں یا وہ ان میں اس طرح منہمک ہو جاتا ہے کہ پھر اُس کو اُس تنگ راہ سے نکلنا محال ہو جاتا ہے اور یا مشغول تو ہوتا ہے لیکن اعتدال کے ساتھ مشغول رہ کر جب فارغ ہوتا ہے تو روح میں ضیق پیدا کرنے والی ان تلویثات سے یکسر جدا ہو جاتا ہے گویا کبھی اُن میں مشغول ہی نہ تھا۔ نفس کی اُس حالت میں جبکہ وہ نفسانی خواہشات سے جدا ہوتا، اور ان علائق سے نجات پاتا ہے "انسان" انوارِ ملکوتی سے فیضیاب اور دنیوی ظلمتوں سے پاک نظر آتا ہے اور وہ عالمِ قدس سے مانوس ہو جاتا، اور ابدی و سرمدی مسرت پاتا ہے۔

اور اگر نفس انسانی ایسے ملکہ سے بہرہ ور ہو کہ اُس سے صرف ایسے ہی افعال صادر ہوتے ہوں کہ جن سے بہ سہولت "اجتماعی اور مدنی نظام" کا صحیح قیام ممکن ہو سکے، اور نفس سے اُن کا صدور خلقی عادت کی طرح ہوتا رہتا ہو تو ایسے ملکہ کا نام "عدالت" (عدل) ہے اس حقیقت کا "راز" یہ ہے کہ "حضرت الٰہیہ کی جانب" سے "اصلاحِ نظام" کے تمام امور جو اس کی مشیت وارادہ میں ہیں "ملائکۃ اللہ اور" پاک ارواح" پر اس طرح نقش ہو جاتے ہیں جس طرح آئینہ میں شکل وصورت نظر آتی ہے۔

لہٰذا جب انسان اپنے قوائے سفلیہ وحسدیہ کو روح کے تابع کر دیتا ہے تو ایک حد تک وہ کدورتوں سے الگ اور "عالمِ قدس" سے قریب تر ہو جاتا ہے اور صفاتِ حسنہ سے بالاتر ہو کر صفاتِ عالیہ کا مالک بن جاتا ہے۔

اور نفس کی تمام مرضیات اسی ایک نظام کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں اور یہی پوری کیفیت دراصل "خالص روح" کی طبیعت و فطرت ہے الخ

یہی وہ چار بنیادی صفات ہیں جو اگر انسان میں پوری طرح راسخ ہو جائیں اور انسان، کمالاتِ علمی و عملی کے لئے اُن کی مقتضیات کی کیفیتوں کا فہم حاصل کرلے اور اُس میں یہ فطانت پیدا ہو جائے کہ وہ ہر زمانہ کے مذاہب الٰہیہ کی تفصیلی کیفیات پر آگاہ ہو جائے تو بلا شبہ اُس کو "خیرِ کثیر"[۱] حاصل ہے اور یقیناً وہ "فقیہ فی الدین"[۲] (دین کے بارہ میں سمجھدار) کہلانے کا مستحق ہے۔ اور اس مجموعی کیفیت اور حالت کا نام ہی فطرت[۳] (سعادت) ہے۔

اس تمام تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ فیلسوف اسلام شاہ ولی اللہ دہلوی۔ اخلاق کی غایت "سعادتِ ابدی" کو سمجھتے ہیں اور سعادت کے اُس درجہ کو جس میں انسان ملکوتی صفات سے مشابہ، اور حق تعالیٰ کے انوار و فیوض سے قریب تر ہو جاتا ہے حقیقی مثلِ اعلیٰ تسلیم کرتے ہیں۔

اور اُن کے یہاں "مثلِ اعلیٰ" کے مختلف درجات ہیں: جو حسبِ استعداد عام صاحبِ اخلاق صالحین سے شروع ہو کر انبیاء علیہم السلام کے درجات تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ درجہ سب سے بلند اور آخری درجہ ہے۔

البتہ "اسلامی نقطۂ نظر سے" اس مسئلہ میں اس قدر تفصیل اور ہے کہ "حقیقی مثلِ اعلیٰ" اپنے درجہ کمال کے اعتبار سے خواہ آخری درجہ پر کسی شخص کو حاصل بھی ہو جائے تاہم وہ "کامل الاخلاق" کہلانیکا مستحق

---

[۱] ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا [۲] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباس کے لئے یہ دعا دی تھی۔ اے اللہ اس کو دین کی سمجھ دے [۳] کل مولود یولد علی الفطرۃ (الحدیث)

[۳] حجۃ اللہ جلد ا بحث سعادت صفحہ ۵۳ تا صفحہ ۵۵

ہوگا مگر نبی اور رسول نہیں کہلائے گا۔ اس لئے کہ یہ "مقام" انسانی جدوجہد کے دائرہ سے بلند ہے اور صرف خدائے تعالیٰ کی عطا و بخشش پر موقوف ہے گویا یہ ایک "منصبِ الٰہی" ہے جو نیابتِ الٰہی کی تکمیل کے لئے کسی انسان کے حصہ میں آتا ہے۔ اسی لئے قرآن عزیز میں تصریح کر دی گئی۔

اللہُ اعلم حیث یجعل رسالتہ — اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت
(الانعام) — کا منصب کس کو عطا کرے۔

ہاں یہ ضروری ہے کہ جو ہستی بھی اس جلیل القدر منصب پر فائز ہو وہ "اخلاقِ کریمانہ" کے بلند صفات سے متصف ہونی چاہئے۔

اور ہر شے کے دو زمانوں (آغاز و کمال) کے اعتبار سے اس منصب کا دورِ کمال اپنی علمی و عملی برتری کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے وابستہ کر دیا گیا۔ پس آپ کا ارشاد گرامی۔

انی بعثت لاتمم حسن الاخلاق — میری بعثت (نبوت و رسالت) اخلاق کریمانہ
وفی روایۃ مکارم اخلاق — اور حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے

اسی حقیقت کا اعلان ہے۔

مسطورہ بالا تفصیل سے یہ بخوبی واضح ہو گیا کہ امام غزالی شاہ ولی اللہ۔ امام راغب اصفہانی کے نزدیک "سعادت" اور "مثل اعلیٰ" کا مفہوم اُس سے بلند تر ہے جس کا نظریہ جدید کے ابواب میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے۔

ان علماءِ اخلاق کے نزدیک دنیوی صلاح و فلاح کے ساتھ حقیقی فلاح و نجات یعنی عالمِ آخرت کی سرمدی و ابدی راحت کا حصول بھی ان دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

اور محقق دوانی فرماتے ہیں۔

نفسِ ناطقۂ انسانی میں دو قوتیں ہیں ایک "قوتِ ادراک" دوسرے "قوتِ تحریک" اور

دونوں قوتوں کی پھر جدا جدا شاخیں ہیں۔

قوتِ ادراک کی ایک شاخ کا نام "عقلِ نظری" ہے اور یہ علمی اَشکال کے قبول کیلئے مبدء تاثیر بنتی ہے۔ اور دوسری شاخ کا نام "عقلِ عملی" ہے اور یہ افعالِ خیر کے فکر و مشاہدہ میں تحریک[1] بدن کے لئے یہ مبدءِ بعید ہوا کرتی ہے۔ اور پھر یہ شعبۂ قوتِ غضب اور قوت شہوت سے تعلق کے وقت ایسی چند کیفیات کے وجود کا مبدء بنتا ہے جو کسی فعل یا افعال کا سبب بنتی ہوں، مثلاً ندامت، خندہ، بکا وغیرہ۔

اور وہم اور قوت متخیلہ کے استعمال کی حیثیت سے جزوی آراء اور جزئی اعمال کے استنباط کا بھی مبدء ثابت ہوتی ہے۔

اور "عقلِ نظری" کے ساتھ نسبت پانے یا دونوں کے باہم یک دگر وابستہ ہو جانے کی حیثیت سے سبب بن جاتا ہے اُن آراءِ کلیہ کے حصول کا جو اعمال کے ساتھ متعلق ہیں۔

اسی طرح قوت تحریک کی پہلی شاخ کا نام "قوت غضبی" ہے۔ یہ مبدء بنتی ہے ایسی مدافعت کا جو غلبہ کے ساتھ امورِ نامناسب کو دفع کرتی ہو۔

اور دوسری شاخ کا نام "قوت شہوانی" ہے یہ مناسب امور کے حاصل کرنے کیلئے مبدء ہے

"قوت ادراک" کا یہ فرض ہے کہ تمام قویٰ بدنی پر اس طرح مسلط ہو جائے کہ کسی طرح ان قویٰ سے منفعل اور متاثر نہ ہونے پائے بلکہ تمام قویٰ اُسی کے تسلط اور قہرانیت میں آجائیں اور یہ جس قوت سے کام لینا چاہے لے سکے اور کسی قوت کو اُس کے حکم کے بغیر کسی قسم کے اقدام کی جرأت باقی نہ رہے تاکہ انسانی ضمیر کی راجدہانی میں نظم و انتظام صحیح رہے اور کسی قسم کا اختلال پیدا نہ ہو۔

[1] تحریک جسم و بدن کے لئے محرک قریب یا خود نفس ہے یا اُس کا ارادہ۔

اور جب ان قوتوں میں سے ہر ایک قوت بمقتضا عقل اپنے خصوصی فعل پر اقدام کرے گی۔ تو قوت ادراک (عقلِ نظری) کی تہذیب و ترتیب سے حکمت حاصل ہوگی، اور عقل عمل کی تہذیب سے عدالت پیدا ہوگی۔ اور قوت غضبی کی ترتیب و تہذیب سے شجاعت، اور قوتِ شہوی کی تہذیب سے عفت عالم وجود میں آئے گی۔

اس تقریر کی بنا پر عدالت قوتِ عملی کے کمال کا نام ہے نہ کہ قوت علمی کے۔

لیکن علماءِ اخلاق اس مسئلہ کی تقریر ایک دوسرے طریقہ سے بھی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ نفس انسان میں تین قوتیں متضاد موجود ہیں اور "نفس" جس قوت کا ارادہ کرتا ہے اسی کے مطابق آثار ہویدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور جب ان میں سے ایک غالب آجاتی ہے تو دوسری بلاشبہ مغلوب یا مفقود ہو جاتی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) **قوتِ ناطقہ**۔ اس کو "نفس ملکوتی" اور "نفس مطمئنہ" بھی کہتے ہیں۔ یہ حقایقِ امور میں فکر و نظر کے شوق اور فکر و تمیز کا مبدء بنتی ہے۔

(۲) **قوتِ غضبی**۔ اس کو نفس سبعی اور نفس لوامہ بھی کہتے ہیں، اور یہ غضب و دلیری، جولانیوں پر اقدام اور سربلندی و تسلط کے شوق کا مبدء ہے۔

(۳) **قوتِ شہوی**۔ اس کا نام نفس بہیمی اور نفس امارہ بھی ہے۔ اور یہ شہوت، طلبِ غذا اور اکل و شرب و نکاح کے ذریعہ حصولِ لذت کا شوق وغیرہ جیسے امور کا مبدء ہے